285

اقبال کا تصوّرِ حیات و موت

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

ڈاکٹر سید اکرم شاہ

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قُدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مِٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یُوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

(اقبال)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

علامہ اقبال ان عظیم مسلمان مفکروں میں سے ہیں جنھوں نے ملتِ اسلامیہ کے احیا کو بالخصوص اور احیائے انسانی کو بالعموم اپنا نصب العین بنایا اور اپنی تمام فکری اور فنی صلاحیتوں کو اس بلند مقصد کی راہ میں صرف کیا۔ اقبال نے گوئٹے کو حکیمِ حیات[1] کہا تھا لیکن وہ خود ایک بلند پایہ حکیمِ حیات ہیں۔ چنانچہ اس جرمن شاعر کے ساتھ خود اپنا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہر دو دانائے ضمیرِ کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات[2]

اقبال کے کلام کا جہاں اور جس جہت سے بھی مطالعہ کیا جائے، وہ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں پر بھی بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں اور فرد و قوم کے روابط و ضوابط کو روشن کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی عظمت اور روز افزوں مقبولیت کا مسلّمہ راز اسی امر میں ہے کہ انھوں نے حزن و یاس کی تاریک فضاؤں میں ڈوبے ہوئے معاشرے کو روشن مستقبل دکھایا اور اس کی مردہ اور افسردہ رگوں میں اپنی دلپذیر اور روح پرور نواؤں سے خونِ زندگی بھر دیا ؎

بصدائے دردمندے، بنوائے دلپذیرے
خمِ زندگی کشادم، بجہانِ تشنہ میرے[3]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے زندگی کو ایک ابدی حقیقت کے طور پر پیش کیا۔ بایں ہمہ اسلامی ادبیات خصوصاً فارسی اور اردو شاعری میں معاملہ اس کے برعکس ظاہر ہوا۔ ایک ہزار سال پر محیط فارسی شاعری کا بیشتر حصہ غم و اندوہ اور حزن و یاس کے دلفریب مضامین سے لبریز ہے جس کی ایک

وجہ ایرانی شعرا کی فلسفیانہ افتادِ طبع ہے۔ وہ اس میدان میں عموماً یونانی فلسفے، بالخصوص افلاطون کے نظریات کے زیرِ اثر رہے جو بقول اقبالؒ مسلکِ گوسفندی کا حامل تھا۔[۴] افلاطون کے نزدیک اسرارِ حیات پردۂ موت میں پنہاں ہیں۔ عالمِ اسباب ایک افسانہ ہے، ہستی دراصل نیستی ہے اور ہنگامۂ موجودات محض سراب ؎

گفت سرِّ زندگی در مُردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نابود گفت[۵]

ان منفی رجحانات نے ایک طرف زندگی کو موت کے سامنے مجبورِ محض قرار دیا اور دوسری طرف اس کے مسلسل حوادث اور کشاکش سے فرار کی تعلیم دی۔ ایران کے بلند پایہ فلسفی شاعر عمر خیام کی رباعیات اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ رباعیاتِ خیام کا اثر تاریخِ ادب میں دیر تک قائم رہا اور حافظ جیسے شاعر نے بھی اسے بہت حد تک قبول کیا۔[۶] جو اپنے اشعار کو فیوضِ قرآنی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔[۷] حالانکہ خیام کے دور یعنی پانچویں صدی ہجری کا اسلامی معاشرہ بہت مستحکم تھا اور ہر طرح کی فاتحانہ اور مدافعانہ قوتوں کا حامل۔ ساتویں صدی ہجری میں چنگیز اور ہلاکو کے خون آشام اور وحشت انگیز حملوں سے بہت سے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی زندگی یکسر تباہ و برباد ہو گئی، ہر طرف بے پناہ خوف و ہراس پھیل گیا اور موت کا سایہ ہر سر پر منڈلانے لگا تو فارسی شاعری کا مذاق جو بہت ہی حساس اور نازک تھا، اس سے سخت متاثر ہوا ـــــ زندگی سے اعتماد بالکل اٹھ گیا اور موت کو ایک ایسی حقیقت تسلیم کر لیا گیا جس کے سامنے زندگی محض مجاز اور موہوم تھی۔

اس شکست خوردہ اور انحطاط یافتہ دور میں مولانا جلال الدین رومیؒ نے زندگی کی بے اعتمادی اور بے بسی کے خلاف زبردست آواز اٹھائی اور اس بات پر زور دیا کہ زندگی ایک ابدی حقیقت ہے اور موت، زندگی کی محض ایک حالت کا نام ہے۔ موت، زندگی کو فنا نہیں کر سکتی۔ رومیؒ نے خیام اور دیگر شعرا اور حکما کی تنوطیت اور بدبینی کے خلاف بھی سخت اقدام کیا اور رجائیت اور روشن بینی کا دل انگیز پیغام دیا۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ امید پسندی اور روشن بینی میں عالمِ اسلام کا شاید کوئی شاعر مولانا کے مقام کو نہیں پہنچتا۔ بقول نکلسن:

"رومی، شر کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ یہ کہنے کی

کوشش کرتا ہے کہ جسے ہم شر کہتے ہیں، وہ دراصل
نظامِ الٰہی کا ایک جزو ہے۔[8]

اس کے باوجود ادبی روایت میں فوری طور پر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا اور بقول فخرالدین عراقی، مولانا رومیؒ کو کسی نے نہ پہچانا۔ بعض مخصوص صوفیانہ تعلیمات کے تحت خود فراموشی اور سکر و مستی کی تعلیم کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور اس کے منفی اثرات ذہنوں پر تیزی سے چھاتے چلے گئے۔ آٹھویں صدی ہجری میں جب تیمور نے ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا تو حافظ شیرازی اپنے بے مثال ساحرانہ انداز میں نواگری کر رہا تھا۔ اس کے آئینۂ کلام میں اگرچہ رُوحِ رومیؒ کا پرتو بھی جلوہ گر تھا، لیکن فکرِ خیام زیادہ واضح اور نمایاں صورت میں کارفرما تھی۔ عصری حوادث کا طوفان کلامِ حافظ میں دنیا کی بے ثباتی اور بے مائیگی کے تصور کو اور بھی مستحکم کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ حافظِ شیریں سخن کا فکر و فن قوم کے دل و دماغ پر جادو کی طرح چھا رہا تھا، کیونکہ یہ زخمی دلوں کے لیے سکون بخش تھا۔ شاعری میں یہ اثر مرزا غالب تک شدت سے برقرار رہا۔ اس کے نتیجے میں ہستی کو محض ایک فریب سے تعبیر کیا گیا اور تصور کیا گیا کہ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔[9] زندگی کو اگر اپنے اظہار اور ارتقا کے لیے کش مکش اور حوادث کی ضرورت ہے تو ہمارے شعرا اس کا تحمل کرنے سے اس لیے معذرت خواہ تھے کہ ان کی طاقت صرف گُبنوں کے ناز اٹھانے کی ضامن تھی۔

اقبال کا دَور ہر اعتبار سے ایک عظیم ابتلا اور آزمائش کا دور تھا جس کا اس نے بڑی بے باکی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس نے ایسے تمام نظریات اور عقاید کی تردید اور تنسیخ کی جو فلسفے اور منفی تصوّف کے عقبی دروازوں سے حریمِ اسلام میں داخل ہو کر مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کر رہے تھے اور ان کی قوتوں کو مفلوج بنا رہے تھے۔ افلاطون اور حافظ اگر فلسفہ و شعر کی تاریخ میں انتہائی طور پر مقبول اور مؤثر تھے، تو بھی اقبال نے انسانی خودی کے اثبات اور اس کی تحکیم و تکریم کی خاطر ان دونوں شخصیتوں کو بیک قلم ہدفِ تنقید ٹھہرایا۔ اس نے دشتِ ادب میں خضرِ راہ بن کر وہ راستے دکھائے جو سرچشمۂ حیات پر منتہی ہوتے ہیں۔ اقبال نے بتایا کہ زندگی کی اساس عقل نہیں، عشق ہے۔ عقل شک و گمان کا شکار ہو جاتی ہے، وہ جراُتِ رندانہ سے محروم ہے اور حریمِ حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ ہستی کا اثبات صرف عشق ہی سے ممکن ہے۔ اس نے ایسا کہنے والوں کی کہ :

"چونکہ مَیں سوچتا ہوں، لہٰذا مَیں ہوں"[10]

بہ زور تردید کی اور کہا ؂

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد، ایں نکتہ کہ ہستم من[11]

عقل راہِ حقیقت میں حیلوں سے کام لیتی ہے جبکہ عشق کاروانِ حیات کو منزل تک کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ عقل کی حیلہ گری اس لیے ہے کہ وہ کمزور ہے اور تصادم سے بچتی ہے جبکہ عشق تصادم کے تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے اور بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے۔ اقبال کے نزدیک جوہرِ حیات تصادم اور کش مکش ہی سے فروغ پذیر ہوتا ہے اور خیر کا شر کے ساتھ تصادم ہی اس کی ہستی کی نمایاں ترین دلیل ہے۔

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید[12]

قوت جس نوعیت اور کیفیت سے بھی عبارت ہو، وہ اپنا اظہار چاہتی ہے کیونکہ اس کا اظہار ہی اس کے وجود پر شاہد ہو سکتا ہے۔ اس اظہار کے لیے زیادہ سے زیادہ کش مکش اور عمل درکار ہے۔ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے عقیدے میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے "کُل" کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی اور ارتباط پر منتج ہوگا۔ دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقاء کے لیے تصادم نہایت ضروری ہے۔"[13]

اقبال یہ تصادم سیاسی اور مادّی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اخلاق یا مذہب یا کوئی روحانی نظام تصادم اور کش مکش سے گریز کی تعلیم دے تو وہ زندگی کے لیے مہلک ہے۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے علامہ نے تصوف کے ان تمام رجحانات پر شدید تنقید کی جن کی رُو سے انسان عرصۂ عمل اور کارزارِ حیات سے گریز کر کے خلوت و انزوا کی طرف بڑھتا ہے اور بالآخر اپنی خودی کی نفی کر دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اخلاق، مذہب اور فن وغیرہ کی صحت کا معیار بھی خودی ہی کی زندگی ہے؛ چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہر وہ چیز جو خودی کو مستحکم بناتی ہے خیر ہے، اور جو

اسے ضعیف بناتی ہے شر ہے، آرٹ، مذہب،
اخلاق کو خودی کے معیار ہی سے جانچنا چاہیے۔[۱۴]

اقبال کے نزدیک ہر چیز کی حیات اس کی خودی کی طاقت سے عبارت ہے۔ لہٰذا کوئی وجود جس قدر اپنے آپ کو قوی اور محکم بنا لیتا ہے، اسی قدر وہ زندگی سے استفادہ کرتا ہے ؎

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است
پس بقدرِ استواری زندگی است[۱۵]

مکتبِ اقبال میں زندگی جدوجہد ہے، استحقاق نہیں۔ دنیا میں ضعیف زندہ نہیں رہ سکتا۔ ضعیفی دراصل ایک عظیم جرم ہے۔ زندگی حرکت، جہادِ حرارت، روشنی، قوتِ استیلا اور ذوقِ تسخیر کا نام ہے ؎

زندگانی قوتِ پیداستی
اصلِ اُو از ذوقِ استیلاستی[۱۶]

اقبال ان اکثر روایتی شعرا اور حکما کے برعکس جو زندگی کے ہاتھوں ہر وقت بیزار اور نالاں رہتے ہیں، جدوجہد اور سخت کوشی کی تعلیم دیتے ہیں اور زندگی کی بقا کے معتقد ہیں ـــــ وہ زندگی کو ایک غیر فانی جوہر تصور کرتے ہیں جو بہر صورت اور بہر تقدیر قائم رہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک صرف زندگی ہی وجود رکھتی ہے، موت، زندگی کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے اور بس ـــــ موت تو مذاقِ زندگی کی تجدید ہے ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے[۱۷]

قرآنِ حکیم "کلّ یومٍ ھو فی شأنٍ"[۱۸] کے تحت زندگی میں جمود اور سکون کی کسی صورت کو قبول نہیں کرتا بلکہ اسے ارتقا کے ایسے لامتناہی راستے پر گامزن کرتا ہے جس میں حیات اپنے مضمر امکانات کا مسلسل انکشاف اور اظہار کرتی اور اس کمال کی طرف بڑھتی رہتی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ـــــ دینِ اسلام زندگی کو پیہم انقلاب اور مسلسل ارتقا سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہ ارتقا درحقیقت معرفتِ الٰہی سے عبارت ہے جس کا حق انسان سے کسی بھی مرحلے پر ادا نہیں ہو سکتا۔

اقبال کے نزدیک چونکہ حقیقتِ مطلق لامتناہی ہے، لہٰذا معرفتِ حق کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے۔ اس طرح زندگی موت کے بعد بھی معرفتِ الٰہی کی راہ میں کوشاں رہتی ہے اور موت اس پر اثر انداز نہیں

ہوئی؛ حتیٰ کہ عالمِ برزخ میں بھی یہی کیفیت برقرار رہتی ہے ؎

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے [19]

قرآن مجید خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کے لیے موت کا لفظ تک گوارا نہیں کرتا؛ چنانچہ انہیں مطلق طور پر زندہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء
ولکن لا تشعرون [20]

چونکہ جسم کے بغیر زندگی کا تصور ہمارے علت و معلول کے رشتوں میں جکڑے ہوئے ذہنوں میں پیدا نہیں ہو سکتا، اس لیے فرمایا کہ تمہیں اس حیات کا شعور نہیں۔

انسان اکثر اوقات مادی رجحانات کے غلبے کے تحت اپنے ماحول کی گوناگوں اشیا سے تعلقات پیدا کر لیتا ہے۔ موت دراصل ان تعلقات کے منقطع ہونے کا ایک نام ہے۔ تعلقات کا یہ سلسلہ جس قدر شدید ہوتا ہے، موت اسی قدر سخت اور شدید ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے خارجی ماحول سے روگرداں اور منقطع ہو کر حق تعالیٰ یعنی اپنی اصلِ اعلیٰ کے ساتھ اپنا روحانی رابطہ استوار کر لیتا ہے تو وہ ہر وقت خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے مقصود کی طرف قدم رکھنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کے لیے خدا کی طرف سے خوشخبری ہے:

یٰاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً
مَّرْضِیَّۃً [21]

نفسِ مطمئنہ یعنی مستحکم خودی کے لیے موت ایک تحفہ ہے۔ موت اس کے لیے فنا ہونا نہیں، بلکہ اپنی منزلِ حقیقی کی طرف حرکت ہے ؎

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور!
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر! [22]

اقبال کے مرشدِ معنوی مولانا جلال الدین رُومیؒ کے نزدیک موت اپنی اصلِ اعلیٰ کی طرف ایک سریع حرکت ہے۔ بالفاظِ دیگر زندگی اور موت خدا کی طرف سے آنے اور اس کی طرف جانے کا نام ہے۔

لیکن وہ افراد جن کا مقصود خدا نہیں، بلکہ کچھ اور چیز ہے، وہ موت کے بعد اسی چیز کے روبرو کیے جاتے ہیں۔ چونکہ خدا کے سوا درحقیقت ہر چیز بے روح، زشت اور مردار ہے، لہٰذا ایسے افراد موت کے بعد اپنے اس مقصود کے اصلی اور حقیقی چہرے کو دیکھنے سے ہراساں ہوتے ہیں کیونکہ موت دراصل اپنے اصلی اور حقیقی چہرے کو دیکھنا اور اپنے اعمال کے روبرو ہونا ہے۔ اگر اعمال اچھے اور دلکش ہیں تو موت بھی اچھی اور دلکش ہے، اور اگر اعمال زشت ہیں تو موت بھی زشت اور خوف ناک ہے۔ موت گویا ایک آئینہ ہے، خوبصورت کے لیے خوبصورت اور بدصورت کے لیے بدصورت۔ بقول مولانا ؎

مرگ ہر یک ای پسر ہم رنگ اُوست
آئینہ صافی یقیں ہم رنگ رُوست
پیش چُرک آئینہ را خوش رنگی است
پیش زنگی آئینہ ہم زنگی است
ای کہ می ترسی زمرگ اندر فرار
آں ز خود ترسانی ای جاں ہوش دار[۲۳]

مولانا موت کو عالمِ سفلی سے عالمِ علوی کی طرف رجوع یا بازگشت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی اصل سے ملنا چاہتا ہے اور یہ وصال یقیناً مقامِ مسرت و انبساط ہے۔ چنانچہ مولانا کہتے ہیں کہ جب میں اس دنیا سے رحلت کروں تو تم تاسف نہ کرو کیونکہ میرے لیے وہی ملاقات اور خوشی کا وقت ہے ؎

جنازہ ام چو بینی مگو: فراق فراق
مرا وصال و ملاقات آں زماں باشد
فرو شدن چو بدیدی، برآمدن بنگر
غروبِ شمس و قمر را چرا زیاں باشد[۲۴]

اقبال کے لیے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ موت سے حق و باطل اور خیر و شر اور کردہ و ناکردہ سب نیست ہو کر یکساں ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک فکر و نظر، ذوق و شوق اور وجدان و شعور کا جسمانی فنا کے ساتھ ضائع ہو جانا امرِ محال ہے ؎

نگاہِ شوق و خیالِ بلند و ذوقِ وجود
مترس از ینکہ ہمہ خاکِ رہگذر گردد

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد![۲۵]

اقبال انسانی بقا پر ایمان رکھتے ہیں اور موت کو مسکرا کر لبیک کہتے ہیں۔ یہی جرأت ان کے نزدیک مسلمان ہونے کی علامت ہے ؎

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست![۲۶]

وہ زندگی کو مسلسل حرکت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق زندگی ہمیشہ نئی سے نئی کیفیات سے دوچار رہتی ہے۔ موت زندگی کو ختم نہیں کرتی بلکہ زندگی موت کو ختم کرتی ہے ؎

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو رازِ ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
اُتر کر جہانِ مکافات میں
کٹھن تھا بہت تھامنا موت کا
اُتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں![۲۷]

علامہ کے نزدیک مومن موت کا شکار نہیں بلکہ موت، مومن کا شکار ہے اور موت اس کے سینکڑوں مقامات میں سے ایک مقام ہے ؎

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ![۲۸]

اگر خودی اوصافِ الٰہی سے متصف ہے تو وہ زندگی سے اس قدر بہرہ مند ہے کہ موت بھی اس کے لیے ایک مقامِ حیات ہے۔ جو فرد اپنی خودی کو اوصافِ خداوندی سے متصف کر کے جاودانی نہیں بناتا، وہ موت سے ہمیشہ خوف زدہ اور لرزہ براندام رہتا ہے۔

قرآنِ مجید میں یہود سے کہا گیا:

فتمنّوا الموت إن کنتم صٰدقین [۲۹]

یعنی اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کر کے دکھاؤ۔ چہ جائیکہ خندہ پیشانی کے ساتھ موت کے رُوبرُو ہونا اور اسے تحفہ سمجھ کر قبول کرنا۔ یہی تعلیم تھی جس کی بنا پر مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے سرشار رہتے تھے۔ ان کا مطلوب و مقصود راہِ حق میں شہادت تھا تاکہ رضائے الٰہی حاصل کریں کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں انسان موت سے بھی نہیں مر سکتا۔

موت سے جسمانی وجود کے متغیّر ہو جانے کے بعد بھی روحانی وجود، جو انسان کا اصلی وجود ہے، باقی رہ سکتا ہے؛ بلکہ یہ امر بعید نہیں کہ وہ روح جو جسم کو حرکت میں لاتے ہوئے ہے، جسم سے علیٰحدہ ہو کر اور بھی زیادہ فعّال اور درّاک بن جائے کیونکہ انسانی وجود میں اصل چیز روح ہے، قالب نہیں۔ قالب تو روح کا مادّی لباس ہے تاکہ روح مادّی عالم میں اپنی مخفی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔ قالب، روح کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ روح، قالب کی وجہ سے وجود میں نہیں آئی۔

بقول مولانا رومیؒ ؎

قالب از ما ہست شد، نی ما از و
باده از ما مست شد، نی ما از و [۳۰]

رومیؒ کے نزدیک روح کا جسمانی لباس سے عریاں ہونا اسے وصال کے بلند ترین مقامات تک پہنچا دیتا ہے ؎

من شدم عریاں ز تن او از خیال
می خرامم در نہایات الوصال [۳۱]

مولانا اسی وجہ سے موت کو دعوت دیتے ہوئے نہایت دلیرانہ لہجے میں کہتے ہیں ؎

مرگ اگر مرد است آید پیشِ من
تا کشم خوش در کنارش تنگ تنگ

من از و جانی برم بی رنگ و بُو
او ز من دلقی ستاند رنگ رنگ [۳۲]

رومی کے نزدیک موت صرف ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کا نام ہے کیونکہ جب کوئی چیز اپنی پہلی حالت کو ترک کرتی ہے تو درحقیقت وہ اس کی موت ہوتی ہے۔ مثلاً بچے کا بطنِ مادر کو ترک کرنا اس کی اس حالت کی موت ہے۔ ارتقائے انسانی کے فلسفیانہ نظریے کے ضمن میں

مولانا کے مندرجہ ذیل اشعار خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہیں۔ ان سے موت کی حقیقت بہت حد تک آشکار ہو جاتی ہے ؎

از جمادی مردم و نامی شدم
و ز نما مردم بہ حیواں سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم کی ز مردن کم شدم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر
تا بر آرم از ملائک بال و پر [۳۳]

رومی کی طرح اقبال کے نزدیک بھی موت محض ایک کیفیت کی تبدیلی اور دگرگونی کا نام ہے البتہ موت کی یہ کیفیت صرف اہلِ ایمان یعنی ان افراد یا ان خودیوں کے لیے مختص ہے جن کا رجوع عرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف ہے جو حیاتِ مطلق اور اصلِ مطلق ہے ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے [۳۴]

اگر انسان خدا سے جو حیِّ مطلق اور سرچشمۂ حیات ہے، دُور ہے تو وہ موت کے خوف سے ہمیشہ ہراساں اور ترساں رہتا ہے۔ اس کی کوئی خوشی بھی حقیقی خوشی نہیں ہوتی بلکہ موت کے بڑھتے ہوئے غم کو فراموش کرنے کا ایک بزدلانہ انداز ہوتا ہے۔ وہ مستی سے نشاط نہیں بلکہ اک گونہ بے خودی تلاش کرتا ہے تاکہ موت اور اس کے لحظہ بہ لحظہ بڑھتے ہوئے ہولناک سائے کو دم بھر کے لیے فراموش کر سکے۔ ہمارے اکثر متفکر شعرا کا یہی حال رہا ہے۔ حکیم عمر خیام جسے مشرق سے بڑھ کر مغرب نے قبول کیا، خصوصاً اسی حالت میں مبتلا نظر آتا ہے، کہتا ہے ؎

پیمانۂ عمر من بہ ہفتاد رسید
ایں دم نکنم نشاط کی خواہم کرد [۳۵]

اس کی وجہ یہ ہے کہ خیام جیسا کہ اس کی رباعیات سے واضح ہوتا ہے، حیات بعد از ممات پر ایمان نہیں رکھتا اور کہتا ہے ؎

ہر لالہ کہ پشۂ مرد نخواہد بشگفت [۳۶]
(یعنی جو پھول مرجھا گیا وہ پھر کبھی نہیں کھلے گا)۔

یا اسی طرح کہتا ہے ؎

تو زر نہ ای ای غافل ناداں کہ ترا

در خاک نہند و باز بیروں آرند[۲۷]

(یعنی اے بے وقوف تو سونا نہیں کہ جسے زمین میں دفن کر کے

پھر باہر نکال لیں)۔

خیام اپنے اسی مادی نظریے کے پیشِ نظر مزید کہتا ہے ؎

باز آمدنت نیست چو رفتی، رفتی[۲۸]

(یعنی تو دوبارہ نہیں آئے گا، جب چلا گیا تو چلا گیا)۔

جلال الدین رومی نے مذکورہ مادی نظریے کی تردید میں کہا ہے

؎ کدام دانہ فرو رفت در زمیں کہ نرست

چرا بہ دانۂ انسانت ایں گماں باشد[۲۹]

(یعنی وہ کونسا دانہ ہے جو زمین میں دفن ہوا اور پھر اگ کر باہر

نہ نکلا؟ تمہیں دانۂ انسان کے متعلق ایسا گمان کیوں ہے؟)

رومی کی طرح اقبال بھی اپنے ایمان اور وجدان کی بنا پر زندگی کو جاودانی سمجھتے ہیں اور اسے ابدیت کی طرف بڑھتی ہوئی اس جوئے رواں سے تعبیر کرتے ہیں جس کے جوش و خروش میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوگی ؎

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود[۳۰]

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

ماخذ

۱۔ پیامِ مشرق / کلیاتِ اقبال (فارسی)، لاہور، شیخ غلام علی۔ اشاعت پنجم۔ سنہ ۱۹۸۵ء
ص ۷ / ۱۷۷

۲۔ ایضاً ص ۱۶ / ۱۸۶

۳۔ زبورِ عجم / کلیاتِ اقبال (فارسی) لاہور، شیخ غلام علی۔ اشاعت پنجم۔ سنہ ۱۹۸۵ء
ص ۱۰ / ۴۰۲

۴۔ "در معنی ایں کہ افلاطونِ یونانی کہ تصوّف و ادبیاتِ اقوامِ اسلامیہ از افکارِ او اثرِ عظیم پذیرفتہ بر مسلکِ گوسفندی رفتہ است ۔ ۔ ۔ ۔"
اسرار و رموز / کلیاتِ اقبال (فارسی) لاہور، شیخ غلام علی۔ اشاعت پنجم سنہ ۱۹۸۵ء
ص ۳۲ / ۳۳

۵۔ ایضاً

۶۔ ایران کا جدید نقاد علی دشتی لکھتا ہے:
"حافظ بیش از خیام نزدیک است۔ افکارِ خیام در سراسر دیوانِ حافظ منعکس است"۔
نقشی از حافظ، تہران ۱۳۳۹، ص ۲۵۴
ایک اور نقاد صادق ہدایت لکھتا ہے:
"طرزِ بیان، مسلک و فلسفہ خیام تاثیر مہمی در ادبیات فارسی کردہ و میدان وسیعی برای جولان فکر دیگران تہیہ نمودہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مخصوصاً حافظ کہ خیلی از افکار خیام الہام شدہ و تشبیہات او را گرفتہ است۔ می توان گفت کہ او یکی از بہترین و متفکرترین پیروان خیام است"۔
رک: رباعیات خیام نیشاپوری؛ تہران ۱۳۲۴، ص ۴۴

۷۔ ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ ۔ بقرآنی کہ اندر سینہ داری ۔ دیوانِ حافظ؛

تہران ۱۳۲۷؛ ص ۲۱۵

۸۔ او را کما ینبغی ہیچ کس ادراک نکرد . . . . .

فروزانفر ۔ زندگانی مولانا جلال الدین محمد، تہران ۱۳۳۲، ص ۱۲۵۔

فخرالدین عراقی کی طرح اقبال نے بھی رومی کے متعلق ایسا ہی کہا کہ ؎

شرح او کردند و او را کس ندید
معنیٔ او چوں غزال از ما رمید

جاوید نامہ / کلیاتِ اقبال (فارسی) لاہور، شیخ غلام علی۔ اشاعت پنجم مئی ۱۹۸۵ء
ص ۲۰۸ / ۷۹۶

۹۔ دیوانِ غالب؛ مرتبہ حامد علی خان۔ لاہور ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۱۵

۱۰۔ محمد علی فروغی؛ سیر حکمت در اروپا، تہران ۱۳۴۴۔ ص ۱۴۹

۱۱۔ پیامِ مشرق / کلیاتِ اقبال (فارسی) لاہور۔ شیخ غلام علی، اشاعت پنجم مئی ۱۹۸۵ء
ص ۱۵۲ / ۳۲۲

۱۲۔ اسرار و رموز / کلیاتِ اقبال (فارسی) مذکور۔ ص ۱۱۰/۱۱۰

۱۳۔ اقبالنامہ؛ حصہ اوّل لاہور۔ شیخ محمد اشرف، ص ۴۶۴ - ۴۶۵

۱۴۔ محمد طاہر فاروقی؛ سیرتِ اقبال، لاہور ۱۹۶۶ء۔ ص ۲۰۵

۱۵۔ اسرار و رموز / کلیاتِ اقبال (فارسی) مذکور۔ ص ۱۴/۱۴

۱۶۔ ایضاً ص ۵۰/۵۰

۱۷۔ بانگِ درا / کلیاتِ اقبال (اردو) لاہور، شیخ غلام علی، اشاعت ششم، ستمبر ۱۹۸۴ء
ص ۲۲۳ / ۲۳۳

۱۸۔ قرآن: ۵۵؛ ۲۹

۱۹۔ ضربِ کلیم / کلیاتِ اقبال (اردو) مذکور۔ ص ۶۴، ۶۵ / ۵۲۶، ۵۲۷

۲۰۔ قرآن: ۲؛ ۱۵۴

۲۱۔ قرآن: ۸۹؛ ۲۸

۲۲۔ ضربِ کلیم / کلیاتِ اقبال (اردو) مذکور۔ ص ۵۵ / ۵۱۷

۲۳۔ مثنوی معنوی۔ دفتر سوم۔ تہران ابیات ۳۴۳۹ - ۳۴۴۱

۲۴۔ کلیاتِ شمس جزو دوم، تہران ۱۳۳۷۔ ص ۵۸
۲۵۔ زبورِ عجم/کلیاتِ اقبال (فارسی) مذکور۔ ص ۸۴/۴۷۶
۲۶۔ ارمغانِ حجاز/کلیاتِ اقبال (فارسی) مذکور۔ ص ۱۱۶/۹۹۸
۲۷۔ بالِ جبریل/کلیاتِ اقبال (اردو) مذکور۔ ص ۱۲۶/۴۱۸
۲۸۔ جاوید نامہ/کلیاتِ اقبال (فارسی) مذکور۔ ص ۱۸۵/۷۷۳
۲۹۔ قرآن ۲: ۹۴
۳۰۔ مثنوی معنوی: دفتر اوّل، تہران۔ بیت ۱۸۱۲
۳۱۔ بدیع الزماں فروزانفر؛ زندگانی مولانا جلال الدین محمد: ص ۱۱۱
۳۲۔ کلیاتِ شمس بدیع الزماں فروزانفر؛ جلد اوّل، تہران: ص ۵۴۰
۳۳۔ مثنوی معنوی۔ دفتر سوم۔ ابیات ۳۹۰۱ تا ۳۹۰۳
۳۴۔ بانگِ درا/کلیاتِ اقبال (اردو) مذکور۔ ص ۲۷۳/۲۷۳
۳۵۔ رباعیاتِ خیام نیشاپوری، تہران۔ ص ۶۴
۳۶۔ ایضاً ص ۵۶
۳۷۔ ایضاً ص ۱۴۲
۳۸۔ ایضاً ص ۵۵
۳۹۔ کلیاتِ شمس۔ جزو دوم۔ تہران ۱۳۳۷۔ ص ۵۸
۴۰۔ پیامِ مشرق/کلیاتِ اقبال (فارسی) مذکور۔ ص ۱۹۲/۳۶۲

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006